انصاف کا کرتب

مائل خیرآبادی

خرگوش اور ہاتھی

جنگل میں اتنے ہاتھی تھے، اتنے ہاتھی تھے۔ ارے بھئی اس قدر ہاتھی کہ لوگ اُسے ہاتھیوں کا جنگل کہتے تھے۔ غول کے غول بڑے بڑے یہ گول مٹول پہاڑ جدھر نکل جاتے، دھرتی ہلنے لگتی۔ ایسا لگتا کہ بھونچال آ گیا۔

یہ ہاتھی بڑے شریر تھے۔ چلتے چلتے سونڈ بڑھا کر پیڑ پودے اُکھاڑ پھینکتے۔ پیڑوں پر چڑیوں کے گھونسلے ہوتے وہ گر جاتے۔ ان کے انڈے بچے تباہ ہو جاتے۔

جنگل میں بہت سے جانور بل بنا کر رہتے تھے۔ یہ ہاتھی ان بلوں پر دوڑ بھاگ کرتے تو زمین دھنس جاتی اور بلوں کے اندر رہنے والے جانور اور کیڑے مکوڑے دب کر مر جاتے۔

چھوٹے چھوٹے جانوروں کو تو چھوڑیئے۔ اِن زندہ پہاڑوں کو دیکھ کر جنگل کے بڑے بڑے جانور سہم جاتے۔ شیر چیتے اور باگھ دم دبا کر بھاگ جاتے۔

اسی جنگل میں کچھ خرگوش رہتے تھے۔ ایک دن ہاتھیوں کا پورا دَل پیڑ پودوں کو اکھاڑتا، کیڑے مکوڑوں کو روندتا اور چنگھاڑتا ہوا خرگوشوں کی طرف جا نکلا۔ زمین ہلی تو خرگوش سمجھ گئے کہ قیامت آ رہی ہے۔ ان کی جانیں سوکھ گئیں۔ ڈر کے مارے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ بوڑھے، کمزور اور بچے جو بھاگ نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے بلوں میں جا گھسے اور سہم کر بیٹھ رہے۔

انہی میں ایک ننھا خرگوش تھا۔ اس نے کبھی ہاتھیوں کو دیکھا نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے خاندان کے خرگوش کیوں بھاگ گئے؟ وہ سر اونچا کر کے کبھی اِدھر اُدھر دیکھتا کبھی بھاگنے والوں کو۔ اسی دیکھ بھال میں وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ہاتھیوں کا دَل سامنے آتا دکھائی دینے لگا۔ وہ سب آندھی کی طرح بڑھے چلے آرہے تھے۔ اب تو ننھا خرگوش ڈرا۔ سمجھ گیا، خطرہ ہے۔ سوچنے لگا کہ ان سے کس طرح بچا جائے۔ جلدی میں اُسے اور کچھ تو نہ سوجھا۔ سامنے ایک موٹا سا درخت تھا۔ درخت کا تنا ایک جگہ سے کھوکھلا تھا۔ ننھا خرگوش کود کر کھوکھلے میں جا گھسا۔ لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی ہاتھی اس پیڑ کو گرا نہ دے۔

ہاتھیوں کے آجانے سے چڑیوں میں بھی ہل چل مچ گئی تھی۔ ہاتھی سونڈیں بڑھا بڑھا کر پیڑ پودے گرا رہے تھے۔ چڑیوں کے گھونسلے زمین پر گر رہے تھے۔ چڑیاں اُڑ اُڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ ننھے خرگوش نے کھوکھلے میں چھپے چھپے کچھ دیر تو چڑیوں کا شور سنا پھر وہ شور بھی بند ہو گیا۔ ننھے نے دل میں کہا۔ شاید ساری چڑیاں کہیں دور بھاگ گئیں، تبھی تو کسی کی آواز نہیں آرہی ہے۔ ہاں، چڑیوں کی آواز کے بدلے پیڑوں کے گرنے، ٹوٹنے اور سیکڑوں ہاتھیوں کی دوڑ بھاگ سے زمین جس بُری طرح ہل رہی تھی وہ سب ننھے کے سامنے تھا۔ اس وقت وہ بالکل اکیلا تھا۔ ڈر کے مارے وہ کھوکھلے کے اندر کانپنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہاتھی اس درخت کے پاس آ گئے۔ درخت ہلا۔ وہ تو کہئے درخت تھا بہت بڑا اور مضبوط۔ اگر کہیں دو چار، دس پانچ سال کا

ہوتا تو ہاتھیوں کی ٹکّر سے زمین پر آ رہتا۔ درخت گرا تو نہیں لیکن ڈر کے مارے ننھا بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ اس کے چاروں طرف ہاتھی ہی ہاتھی تھے۔ جو زور زور سے چنگھاڑ بھی رہے تھے۔ ان کی چنگھاڑ سن سن کر ننھے کی جان نکلی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شور و غل کم ہوا۔ پھر اور کم ہوا، پھر اور کم اور زمین کا ہلنا بھی بند ہوا اور پھر اسے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سمجھ گیا کہ بلا ٹل گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پہلے تو کھوکھلے سے جھانک کر دیکھا۔ پھر جب اُسے اطمینان ہو گیا تو کود کر باہر آ گیا۔ اور اپنی بستی کی طرف چلا۔ قریب پہنچا تو بِلوں سے خرگوشوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ خرگوشوں میں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ بہت سے خرگوش بِلوں میں تھے۔ زمین دھنس گئی۔ وہ سب پِس کر رہ گئے۔ بستی بھر میں ہائے واویلا مچی تھی۔ مرنے والوں کے پاس رونے والے بیٹھے رو رہے تھے۔ اس دن کسی خرگوش نے نہ تو کھانا کھایا اور نہ رات کو سویا ہی۔ رات کو کچھ خرگوش بِلوں سے نکل کر دوسروں کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ لیکن زیادہ تر ایسے تھے جو ایسے سہمے ہوئے تھے کہ رات کو بھی بِلوں سے نہ نکلے۔

خرگوشوں کی اس چھوٹی سی بستی پر یہ نئی بلا آئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ ہاتھی ایک دوسرے راستے سے ندی کی طرف نہانے کو جایا کرتے تھے۔ آج وہ اس راستے سے گذرے اور ان غریب خرگوشوں پر جو کچھ بیتنا تھی، بیت گئی۔ مگر ان ظالموں کو اس سے کیا۔ پنکھوں کی طرح کان ہلاتے، چیختے چنگھاڑتے زلزلے کو ساتھ لئے آئے اور نکل

گئے۔ انھیں کیا، کون مرا اور کون جیتا رہا۔ جنگل میں ان کی تعداد زیادہ، طاقت میں بھی وہ زیادہ، بس انہی کا راج تھا۔ کس کی مجال تھی کہ روک ٹوک کرتا۔

یہ پہلا دن تھا، خرگوش بے چارے رو دھو کر چپ ہو رہے۔ لیکن دوسرے دن پھر سارے ہاتھی پھر اسی طرح اودھم مچاتے، قیامت ڈھاتے آئے اور جس کی موت لکھی تھی اُسے پیستے چلے گئے۔ تیسرے دن پھر اسی مصیبت کا سامنا ہوا۔ اب تو خرگوشوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ننھے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی برادری کے لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے تو وہ مکھیا کے پاس گیا۔ اس نے مکھیا کو سلام کیا اور ایک طرف ادب سے بیٹھ گیا۔ مکھیا نے پوچھا:

''ننھے! کیسے آئے، تمہارے ابا تو اچھے ہیں؟''

''بابا! ننھے نے کہنا شروع کیا۔'' بابا! جو کچھ خیریت ہے وہ تو آپ کے سامنے ہے لیکن یہ تو بتایئے، ہم ان ظالموں کا ظلم کب تک اُٹھاتے رہیں گے؟''

''مگر بیٹے! ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟'' بوڑھے خرگوش نے درد بھرے لہجے میں کہا اور گردن جھکا لی۔

اس بات کو سن کر کچھ اور خرگوش ان کے پاس کھسک آئے اور پھر ایک ایک کر کے سبھی آ گئے اور اچھی خاصی پنچایت بیٹھ گئی۔ ان میں سے ایک نے آہ بھرتے ہوئے کہا:

''اب تو بستی کہیں اور بسانی پڑے گی۔'' یہ سن کر ایک اور خرگوش بولا: ''اور وہاں بھی ان ہاتھیوں نے آ کر اودھم مچایا تو پھر کوئی اور جگہ تلاش کرنا ہوگی۔''

''نہیں تو کیا ہاتھیوں سے جنگ کریں گے۔'' ایک اور خرگوش نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔

''ہاں! ضرورت پڑی تو جنگ بھی کریں گے۔'' ننھے خرگوش نے جوش کے ساتھ کہا تو سارے خرگوش اداس ہوتے ہوئے بھی اُس کی بات پر ہنس پڑے اور ننھا خرگوش کھسیا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ سوچ کر بوڑھے مکھیا خرگوش نے کہا۔ ''کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم اپنے میں سے ایک سمجھ دار خرگوش کو ہاتھیوں کے سردار کے پاس بھیجیں اور یہ بات سمجھائیں کہ ان کے اس طرف سے گذرنے پر بہت سی جانیں جاتی ہیں۔ اس لئے تکلیف فرما کر اپنے اسی پُرانے راستے سے ندی پر تشریف لے جایا کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔ پھر دوسرے ہی دن ایک خرگوش ہاتھیوں کی خاص بستی کی طرف گیا تو ننھا بھی اس کے ساتھ تھا۔ سب نے چلتے وقت ننھے کو روکا مگر وہ نہ مانا۔ وہ تو ہاتھیوں کی بستی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہاتھیوں کے گھر بہت ہی بڑے اور اونچے ہوں گے۔ لیکن یہاں آ کر دیکھا تو سردار جی زمین پر بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس بہت سے ہاتھی کچھ لیٹے، کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے جھوم رہے تھے۔

ننھا خرگوش بڑے خرگوش کے ساتھ پھُدکتا ہوا سردار کی طرف چلا۔ ہاتھیوں کے سردار نے ان دونوں کو دیکھا۔ وہیں سے ڈانٹا۔

''یہ کون بدتمیز ہیں جو بلا اجازت ہمارے دربار میں پھُدکتے چلے آ رہے ہیں؟'' یہ ڈانٹ سن کر ننھا خرگوش تو اسی جگہ سہم کر رُک گیا۔ لیکن بڑا خرگوش ہاتھ جوڑ کر

آگے بڑھا اور سلام کر کے بولا:

''حضور! اس جنگل کے راجہ ہیں اور میں اسی جنگل میں آپ کی رعایا۔ حضور! پھُدک کر چلنا ہماری چال ہی ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔''

''اچھا معاف کیا، اب بتاؤ کیوں حاضر ہوئے؟''

''میں خرگوشوں کی بستی سے آیا ہوں اور آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''کہو، کیا کہتے ہو؟''

''حضور! جب آپ اپنے لشکر کے ساتھ نکلتے ہیں......''

''تو؟'' ہاتھیوں کا سردار گرجا۔ اس نے خرگوش کی بات بھی پوری نہ سنی۔

''تو حضور! کئی خرگوش مر جاتے ہیں، بہت سے زخمی ہو جاتے ہیں۔''

''تو ہم کیا کریں؟''

''حضور! یہ مہربانی کریں کہ تین چار دن پہلے آپ جس راستے سے نہانے جاتے تھے۔ اگر اسی راستے سے جائیں تو بہت سی ننھی منی جانیں بچ جائیں۔''

''کیا مطلب؟'' کیا ہم تم سفید چوہوں کے ڈر سے اپنا راستہ بدل دیں؟''

''حضور! ڈر کس بات کا۔ پھر آپ اور ہم سے ڈریں۔ ہم تو یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ کے راج میں جینے کا حق سبھی کو ملنا چاہیے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنا راستہ نہیں بدل سکتے۔ تم کہیں اور جا کر رہو۔ اور

دیکھو، ہم چاہتے بھی یہی ہیں کہ اس جنگل میں ہماری ہی برادری رہے۔ ہمارے علاوہ جو رہنا چاہے وہ ہمارے رحم و کرم پر رہے تو رہے ورنہ یہاں سے نکل جائے۔ ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔''

دور کھڑا ننھا خرگوش یہ ساری باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ ہاتھیوں کے سردار کی باتیں اُسے بہت بُری لگیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔''بڑا گھمنڈی ہے ہاتھیوں کا سردار۔'' پھر جب بڑا خرگوش واپس ہوتا ہوا اس کے پاس آیا تو اس کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں بڑے خرگوش سے کہنے لگا:

''چچا میاں! اب کیا کرو گے؟''

''دیکھئے، مکھیا کی جو رائے ہو، خیال ہے کہ اس جنگل سے کہیں اور جانا ہی پڑے گا۔''

''میری رائے ہے کہ سب مل کر یہ سوچیں کہ اس جنگل سے ہاتھیوں کو کیسے بھگایا جاسکتا ہے۔ ہم کیوں اپنا گھر چھوڑیں؟''

''بڑا خرگوش ہنسا۔'' بچے ہو، تم کیا جانو، جب ظالم ظلم کرنے پر آجاتا ہے تو اپنے سے کمزوروں کی تدبیریں چلنے نہیں دیتا۔''

ننھا خرگوش چپ ہو گیا لیکن وہ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ ان ہاتھیوں کو کس طرح ان کے کرتوتوں کا مزا چکھایا جاسکتا ہے۔

پھر جب دونوں مکھیا کے پاس پہنچے۔ تو سبھی خرگوش پھر اکٹھا ہو گئے۔ ہاتھیوں کے سردار کا روکھا جواب سن کر سب نے لمبی سانسیں بھریں۔ ایک خرگوش کی زبان سے

نکلا۔ ''اچھا بھائی! اب ہم کہیں اور ہی جا کر رہیں گے۔''

''ٹھیک ہی کہتے ہو بھائی! کون ان سر پھروں کے منہ لگ کر اپنی جان گنوائے۔''

دوسرے خرگوشوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

سارے خرگوشوں کی گردنیں جھک گئیں اور وہ اُداس ہو گئے۔ لیکن ننھا خرگوش کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھ کر بولا:

''تو کیا اب ہم بستی پر بستی بساتے پھریں گے؟''

''نہیں تو کیا یہاں رہ کر اپنی جانیں دے دیں! ایک خرگوش نے ننھے کو ڈانٹ دیا۔ ''بھلا ہاتھیوں سے ٹکّر کون لے سکتا ہے ننھے میاں۔''

ننھے کو غصہ آ گیا۔ وہ مکھیا سے کہنے لگا۔ ''میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ بتائیے! یہ جنگل جس دھرتی پر کھڑا ہے کیا وہ دھرتی ہاتھیوں نے بنائی تھی مکھیا جی؟''

''نہیں بیٹا! یہ دھرتی تو ہمارے تمہارے اور سب کے خدا نے بنائی ہے۔'' مکھیا نے پیار بھری نظروں سے ننھے کو دیکھا۔

''تو یہ جنگل ان ہاتھیوں کا لگایا ہوا ہے؟''

''نہیں بیٹا! یہ جنگل بھی خدا کا لگایا ہوا ہے۔''

''تو پھر یہ ہاتھی کون ہوتے ہیں اس پر قبضہ کرنے والے۔ مالک بن کر بیٹھنے والے۔ دوسروں کو ستانے والے؟''

''بیٹا! یہ سب طاقت کا غرور ہے اور ہم کمزور ہیں۔''

''ایک دن میری نانی نے کہانی سناتے ہوئے بتایا تھا کہ دنیا میں بہت بار ایسا ہوا ہے کہ کمزوروں نے بلوانوں کو ہرا دیا ہے۔ میری رائے ہے کہ یہاں سے بھاگنے کے بجائے سر جوڑ کر بیٹھئے اور سوچئے کہ ہاتھیوں کو کس طرح بھگایا جا سکتا ہے؟''

''بیٹا! تم نے نانی سے یہ بھی سنا ہوگا کہ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔'' ننھے میاں! خدا نہ کرے کہ کسی ظالم اور زبردست سے پالا پڑ جائے۔ ساری سٹّی گُم ہو جاتی ہے، سمجھے!''

''تو کیا سچ مچ آپ سب صاحبان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے؟''

''ضرور چھوڑ دیں گے۔ اپنی جان بچانا ہے جو۔''

''میں تو نہیں جاؤں گا۔''

''تم کیا کر لو گے ان کا؟''

''میں ان سے اپنے بزرگوں کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گا۔''

''ہی ہی ہی۔'' سارے خرگوش ہنس پڑے۔ ''مینڈکی بھی چلی مداروں کو۔''

ننھے کو بہت بُرا لگا۔ اُسے سب نے بے وقوف بنایا اور پھر اپنے پریوار کو لے کر جنگل سے جانے لگے۔ ننھا خرگوش سب کو جاتے دیکھ رہا تھا اور اپنی جگہ سوچ رہا تھا۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔

ننھا پھر ننھا تھا۔ اسے اپنے بچپنے کا احساس بھی تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر سمجھ سے کام لیا جائے تو کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور نکل آئے گی۔ وہ سوچتا رہا۔ سارے خرگوش جنگل سے چلے گئے اور وہ سوچتا ہی رہا۔ پھر جب وہ بالکل

اکیلا رہ گیا تو جنگل میں ایک طرف کو دھیرے دھیرے چلا۔

وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں اسے ایک ننھی سی گلہری ملی۔ خرگوش نے پوچھا:

''گلّو باجی! تم اکیلی کیوں پھر رہی ہو؟''

''میرے گھر والے ہاتھیوں کے ڈر سے جنگل چھوڑ کر چلے گئے۔''

''تم کیوں نہیں گئیں؟''

''میں بھاگنا بزدلی سمجھتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ ظالم کے مقابلے میں کچھ تو دم خم دکھانا چاہیئے۔''

''بالکل ٹھیک کہتی ہو گلّو باجی!''

''پر میری برادری کے لوگ یہ نہیں سمجھتے۔ الٹے سب نے مجھے بے وقوف بنایا۔''

''چلو یہ خوب رہی، میں بھی تمہاری ہی طرح اکیلا رہ گیا۔ اب آؤ ہم تم مل کر سوچیں کہ ان ظالموں سے کیسے نمٹا جائے؟''

ننھا گلہری کے ساتھ چلا۔ تھوڑی دور پر دونوں نے ایک چیونٹی کو دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر رینگ رہی تھی۔ ننھے نے پوچھا۔ ''تم اکیلی کیوں پھر رہی ہو منی بی!''

''کیا کروں پھُدکو بھیا! میری برادری کے لوگ جنگل چھوڑ کر چلے گئے۔''

''کیوں؟''

''ہاتھیوں کے ظلم سے۔''

''تم کیوں نہیں گئیں؟''

''میں ان ظالموں سے بدلہ لینے کی سوچ رہی ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''اچھا تو آؤ ہمارے ساتھ، ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔''

تین ساتھی ہو گئے۔ گھومتے گھومتے وہ جنگل کے ایک کنارے پر پہنچے۔ وہاں انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ آدمی ندی سے ایک نالی بنا رہا تھا۔ ننھا اپنے ساتھیوں کو لے کر کھڑا ہو گیا۔ دیکھتا رہا۔ آدمی نے اپنے کھیتوں تک نالی بنائی، پھر پانی کھول دیا اور بیٹھ کر سستانے لگا۔ ننھا اس کی سوجھ بوجھ پر حیران رہ گیا۔ ''بڑا قابل ہے یہ۔'' اس نے گلہری سے پوچھا:

''گلّو باجی! یہ کون ہے؟''

''پھُدکو بھیّا! یہ آدمی ہے، آدمی کو اللہ نے بڑی سمجھ دی ہے۔ یہ اپنی سمجھ سے خوب سوچتا ہے۔''

''تو پھر آؤ، اس سے ترکیب پوچھیں۔''

''ہاں چلو!'' تینوں کی یہی رائے ہوئی۔ تینوں آدمی کے پاس پہنچے اسے سلام کیا۔ آدمی نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''کہاں سے آرہے ہو تم سب؟''

ننھے نے اپنی اور جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تباہی کی کہانی سنائی۔ پھر آدمی سے کہا کہ وہ ہماری مدد کرے۔ سوچ کر بتائے کہ ہم کسی طرح ہاتھیوں سے لڑ سکتے ہیں۔

آدمی سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے وہ مسکرایا۔ ذرا ہمت کا کام ہے اور بس فتح تمہاری ہے۔"

"ہم ہمّت کریں گے۔" تینوں نے کہا۔

"اچھا تو سنو، یہ دیکھو، میرے پاس گڑ کی بھیلی ہے۔ میں اسے پانی میں گھول کر شربت بناتا ہوں۔ اب تمہاری گلّو باجی یہ کریں کہ اپنی دُم شربت میں بھگو کر ہاتھیوں کی طرف جائیں۔ جب وہ سب سو رہے ہوں تو اپنی دُم ان کی سونڈوں کے اندر کر دیں۔ یہ خیال رکھیں کہ شربت ان کی سونڈوں کے اندر لگ جائے۔ یہ کام کرلو۔ پھر میں آگے بتاؤں۔"

گلہری کے بھی دل سے لگی تھی۔ اُس نے شربت میں دُم کو ڈبویا۔ دوڑتی ہوئی ہاتھیوں کی طرف گئی۔ ہاتھی سو رہے تھے۔ اس نے سب کی سونڈوں میں شربت لگانا شروع کیا۔ جب وہ اپنی دُم سونڈوں میں کرتی تو ہاتھیوں کو گدگدی لگتی، وہ سونڈ ہلاتے۔ گلہری اُچک کر دوسرے ہاتھی کی سونڈ پر دکھائی دیتی۔ اُس نے بڑی محنت اور چستی سے یہ کام کیا۔ جب اُس کی دُم کا شربت ختم ہو جاتا تو وہ دوڑ کر پھر بھگو لاتی۔ جب وہ یہ کام کر چکی تو آدمی نے چیونٹی سے کہا۔ "تمہاری برادری کے لوگ کدھر گئے ہیں؟" چیونٹی نے بتایا کہ وہ ابھی جنگل کے کنارے نہیں پہنچے ہوں گے۔ اسی جگہ ہوں گے۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔" آدمی نے دوسری ترکیب بتائی۔ "گلّو بی! اب ذرا سی محنت اور کرو۔ شربت میں دُم ڈبو ڈبو کر چیونٹیوں کی طرف جاؤ اور شربت کی ایک لکیر

چیونٹیوں تک بنا دو۔'' گلہری نے یہ کام بھی کر دیا۔ تو اب چیونٹی مسکرائی۔ آدمی نے پوچھا۔ ''تم کیا مسکرا رہی ہو؟'' وہ بولی:

''سچ مچ خدا نے تم کو بڑی اچھی سمجھ دی ہے۔ اب ہو گا یہ کہ چیونٹیوں کا لشکر مٹھاس کے لالچ میں پلٹ پڑے گا اور اسی لکیر پر چلتا چلتا ہاتھیوں کی سونڈوں میں گھس جائے گا پھر مزا آجائے گا۔ آہاہا۔''

''اچھا تو میں جاتا ہوں۔ اب تم تینوں ان ظالموں کی بربادی کا تماشہ دیکھنا۔''

آدمی نے اپنا پھاوڑا کندھے پر رکھا اور ایک طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ننھے خرگوش نے، ننھی گلہری نے اور منّی چیونٹی نے دیکھا کہ چیونٹیوں کا لشکر ہاتھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ تینوں ایک ٹیلے پر بیٹھے اور دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے؟

چیونٹیاں شربت کی لکیر پر چلتے چلتے ہاتھیوں کی سونڈوں میں گھس گئیں۔ پہلے تو رینگتی رہیں پھر جب ہاتھیوں نے سونڈیں ہلائیں تو کاٹنا شروع کر دیا۔ کاٹنا شروع کیا تو ہاتھی اُٹھ کر اِدھر اُدھر بھاگنے اور سونڈیں پٹکنے لگے۔ چیونٹیاں اور زور سے کاٹنے لگیں۔ ہاتھیوں پر مصیبت آگئی۔ وہ بھاگنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑنے لگے۔ اور زور زور سے سونڈیں پٹکنے لگے۔ مگر چیونٹیوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک ایک ہاتھی کی سونڈ میں سیکڑوں چیونٹیاں گھسی ہوئی تھیں۔ جنگل میں ایک قیامت مچی ہوئی تھی۔ زمین ایسی کبھی نہیں ہلی تھی جیسی اُس دن۔ ننھے میاں اپنے دوستوں کو لئے دور ٹیلے پر بیٹھے دیکھ رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ وہ دیکھتے رہے دیکھتے رہے۔ سارا دن اور ساری رات ہاتھی شور

مچاتے، سر پٹکتے اور چنگھاڑتے رہے۔ دھیرے دھیرے ان کی چیخیں گم ہونے لگیں۔
دوسرے دن صبح ننھے میاں نے ٹیلے پر سے دیکھا ہاتھی جنگل میں مرے پڑے تھے۔
"فتح ہماری ہے۔" ننھے میاں چیخے اور اپنے دوستوں سے کہا کہ دوڑ کر اپنی اپنی برادری کے پاس جائیں اور سب کو واپس جنگل میں بُلا لائیں۔ اور پھر خود اپنے خرگوشوں کی طرف پھُدکتے چل دیئے۔ وہ ملے ان سے کہا۔ "میں نے ہاتھیوں کو مار گرایا۔" خرگوشوں نے یہ سنا تو وہ اُداس ہوتے ہوئے بھی ہنسنے لگے۔ بولے۔ "ننھے! تو بھاگ آیا، بڑا اچھا ہوا، مگر ہے بڑا مسخرہ۔ سب تو گھر چھوٹنے پر رو رہے ہیں۔ تو اب بھی اپنی ڈینگ مار رہا ہے۔"

ننھے نے کہا۔ "تم کو میری بات پر یقین نہیں آتا۔"

خرگوش پوچھنے لگے۔ اچھا یہ بتا کہ تو نے ہاتھیوں کو کس طرح مارا۔

ننھے نے ساری کہانی سنائی۔ سب نے کہا کہ ہاں، اب کچھ یقین آیا۔ چلو چل کر دیکھیں۔

اس کے بعد جب سارے جانور پھر جنگل میں آ گئے تو ننھے خرگوش نے کہا:

"ہماری نانی نے بہت ٹھیک کہا تھا کہ بہت بار ایسا ہوا کہ کمزوروں نے بلوانوں کو ہرا دیا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر رہیں۔ تدبیر سوچتے رہیں۔ دعا کرتے رہیں۔ اللہ کمزوروں کی ضرور سنتا ہے۔" (بزرگ سے)

☆☆☆

ایک مولوی صاحب

جیل میں مجھ کو کچھ ہی دن بیتے تھے کہ ہماری جیل میں ایک ایسے بزرگ آدمی کو قیدی بنا کر لایا گیا کہ ہم سب ہکّا بکّا رہ گئے۔ وہ بزرگ آدمی قیدی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ بڑی پیاری داڑھی تھی ان کی۔ عینک لگائے ہوئے تھے۔ پائجامہ اور کُرتا پہنے ہوئے تھے۔ ان کا لباس قیدیوں والا تھا ہی نہیں۔ پیشانی پر سجدے کا نشان چمک رہا تھا۔ انھیں لا کر سلاخوں والی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ کیسے قیدی ہیں۔ ہمیں تو کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انھیں نہیں، ان کی نگرانی ہم سب سے زیادہ ہوتی ہے۔"

میرا جی چاہا کرتا تھا کہ ان سے ملاقات ہو تو پوچھوں کہ "مولوی صاحب آپ نے کیا جرم کیا کہ جیل لائے گئے۔ یہاں تو چور، اُچکّے، ڈاکو، بدمعاش قسم کے لوگ رکھے جاتے ہیں۔"

اس طرح پوچھنے کو دل تو چاہتا تھا۔ لیکن مجھے ایک دن بھی موقع نہیں ملا۔ میں روز دیکھا کرتا تھا کہ وہ سویرے اٹھتے، وضو کر کے نماز پڑھتے، پھر قرآن پڑھتے تھے۔ پھر کچھ دیر تک لکھتے پڑھتے۔ دوپہر تک وہ اسی طرح کے کام کرتے رہتے۔"

"تو سچ مچ وہ مولوی صاحب ہوں گے؟"

''تو بابا کون صاحب تھے وہ:''

''بتاتا ہوں۔ اچھا تو وہ دوپہر کو کھانا کھا کر تھوڑی دیر لیٹتے۔ پھر ظہر کے وقت اٹھتے۔ ظہر کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد پھر لکھنے پڑھنے میں لگ جاتے۔ عصر کے وقت تک کام کرتے۔ عصر پڑھ کر ٹہلتے۔ لیکن اپنی سلاخوں کے اندر ہی۔ وہاں سے نکلنے کی انھیں اجازت نہیں تھی۔ بے چارے نہ کسی سے بات کر سکتے۔ نہ کچھ بول سکتے۔''

''ارے تو ان مولوی صاحب نے کیا کیا تھا؟''

''بتاتا ہوں۔ پھر کوئی آٹھ دس دن میں وہ ایک اور کمرے میں لے جائے گئے۔ مجھے بھی ان کے کمرے میں کر دیا گیا۔ اب میری ڈیوٹی چکّی پیسنا نہیں تھی۔ اب میری ڈیوٹی یہ تھی کہ ان مولوی صاحب کا کام کاج کروں۔ مجھے اب اور زیادہ تعجب ہوا کہ یہ کیسے قیدی ہیں کہ ان کی خدمت کے لئے ایک نوکر دیا گیا۔''

''تو بابا آپ نے ان سے پوچھا بھی یا نہیں؟''

''پوچھ تو لیا۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ مولوی صاحب آپ نے کیا کیا تھا کہ آپ کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ پھر آپ سے قیدیوں کی طرح کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہاں لا کر بند کر دیا گیا ہے اور بس۔''

''میں نے اس طرح کہا تو بولے۔ ''بھئی میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا نہ چوری کی نہ ڈاکہ ڈالا۔ نہ کسی سے لڑا نہ کسی کا پیسہ مارا۔ مجھے سرکار نے کسی جرم کے بغیر ہی بند کر دیا اور مجھے بھی نہیں بتایا کہ کس جرم میں مجھے بند کر دیا گیا۔''

''ارے بابا بے خطا ہی؟'' ہم سب ایک دم بول اٹھے۔ بابا نے کہا۔ ''بھئی جب میں نے مولوی صاحب سے سنا تو اسی طرح ''ارے'' میری زبان سے بھی نکلا تھا۔''

''تو بابا! کوئی بات ہوگی ضرور؟''

''ہاں بعد میں مولوی صاحب نے بتایا کہ سرکار نے ایک قانون ایسا بھی بنایا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے جس کو سرکار چاہے، بند کردے۔ ایسے قیدی سیاسی قیدی کہلاتے ہیں۔''

''سیاسی قیدی کے کیا معنیٰ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی! مولوی صاحب ہی نے مجھے بتایا کہ سیاسی قیدی ان لوگوں کو کہتے ہیں جن سے سرکار کو یہ کھٹکا ہوتا ہے کہ وہ اس سرکار کے بدلے دوسری سرکار بنانا چاہتے ہیں۔''

''تو بابا! وہ مولوی صاحب ایسے ہی ہوں گے؟''

''ہاں میاں! وہ ایسے ہی تھے مگر سنو! مولوی صاحب کہتے تھے کہ ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے کوئی اُودھم مچے یا گڑبڑ ہو۔ ہم تو یہ کہتے تھے کہ یہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ وہی اللہ اس دُنیا کا مالک ہے۔ اسی مالک کا اس دنیا میں قانون چلنا چاہئے۔ اللہ کے قانون کے سوا سارے قانون غلط ہیں۔ بس ہمارا یہی جرم ہے کہ ہم اپنے اللہ کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی پوری کرو کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو۔ سرکار بھی ایسی بننا چاہئے جو اللہ کی مرضی کے مطابق کام کرے۔''

''تو بابا! اس میں کیا بات ہے۔ بات تو یہی ٹھیک ہے جو مولوی صاحب نے کہی۔''

''ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر جو لوگ یہ نہیں مانتے اُن کو بُرا لگتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو ستاتے رہتے اور انھیں ایسی بات کہنے اور کرنے سے روکتے تھے۔''

''ارے بابا! ذرا سنئے تو پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تو اسی لئے ستایا گیا تھا۔''

''ہاں بیٹا! بس یہی جرم تھا مولوی صاحب کا۔''

''پھر مولوی صاحب کتنے دن جیل میں رہے؟''

''اُف..........فوہ۔''

اُف کہہ کر بابا کسی سوچ میں پڑ گئے اور بولے۔ ''میں مولوی صاحب کا سارا کام کاج کرتا، ان کے لئے پانی لاتا، میں ان کے لئے چائے بناتا اور پلاتا، ان کا کھانا پکا کر انھیں کھلاتا۔''

''اور سنئے تو بابا!'' پپو بی نے کہا۔ ''کیا مولوی صاحب کا کھانا سب قیدیوں سے الگ پکتا تھا؟''

''ہاں بیٹی!'' بابا نے بتایا اور اسی کے ساتھ بولے:

''ان مولوی صاحب کے سارے کام اور ساری ضرورتیں دوسرے قیدیوں سے الگ تھیں۔ میرے سوا کسی اور قیدی کو اجازت نہیں تھی کہ مولوی صاحب سے ملے۔ اور میں بھی بس اسی وقت جب تک کہ ہم قیدیوں کو کام کرنا پڑتا۔ اس کے بعد ہم الگ اپنی کوٹھری میں بند کر دیئے جاتے اور مولوی صاحب اپنی جگہ۔''

اچھا تو یہ تم سب کو معلوم ہو چکا کہ مولوی صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ بڑے آدمی کا مطلب یہ ہے کہ چاہے وہ بڑے پیسے والے نہ ہوں لیکن وہ لیڈر ضرور بڑے تھے۔ ''لیڈر کسے کہتے ہیں بابا؟'' شوکت نے پوچھا۔ بابا نے بتایا۔ ''لیڈر اس شخص کو کہتے ہیں جس کے کہنے پر لوگ چلیں۔ تو بھائی! مولوی صاحب کے کہنے پر بہت سے لوگ ہوں گے اور ان سب کی بھاری جماعت ہوگی۔ اسی لئے تو اس وقت کی سرکار ان سے ڈر رہی ہوگی۔ کہیں یہ سب مل کر سرکار ہی کو نہ بدل دیں اور تم جانو، مولوی صاحب میں اللہ تعالیٰ نے ایسی قابلیت بھر دی تھی اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو لیڈر مانا جاتا۔''

''یہ آپ نے کیسے جانا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں نے اس طرح جانا۔'' بابا نے جواب دیا۔ مولوی صاحب کو گھمنڈ ذرا بھی نہ تھا۔ مجھ کو دیکھو میں ڈاکو تھا اور مولوی صاحب اللہ والے آدمی۔ نماز روزہ ادا کرنے والے۔ قرآن پڑھنے والے۔ اچھی اچھی باتیں بتانے والے۔ ''میرے ان کے مرتبے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔'' مگر دیکھو تو جب میں کھانا پکا کر مولوی صاحب کے لئے لے کر جاتا تو مجھے ساتھ بیٹھا لیتے اور ساتھ ہی کھانا کھلاتے۔ میں نے پہلے پہل انکار کیا تو بولے:

''تم تو مسلمان ہونا!'' میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں! میں مسلمان ہوں''

''تو پھر ساتھ کھاؤ میرے۔ میں بھی تو مسلمان ہوں۔'' مولوی صاحب کے اس کہنے پر میں نے کہا۔ ''صاحب مسلمان مسلمان میں فرق ہوتا ہے۔ کہاں آپ، کہاں میں۔

آپ ولی اللہ آدمی اور میں ناپاک، گندہ، اور چور بدمعاش۔ میری آپ کی برابری ہی کیا۔"

"مولوی صاحب کے سامنے جس وقت میں یہ کہہ رہا تھا۔ اُس وقت پہلے پہل میرے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ چوری کرنا اور ڈکیتی کرنا بری بات ہے۔ نہیں تو اس سے پہلے میں نے ادھر دھیان ہی نہ دیا تھا۔ اچھا میں نے جب مولوی صاحب سے یہ کہا تو وہ بولے۔ "تو چوری ڈکیتی سے توبہ کرلو۔ اللہ تو بڑا مہربان ہے۔ تمہارے گناہ کو معاف کردے گا۔ پھر تم نماز پڑھو، روزہ رکھو، سچ بولو، کسی کی چیز بے پوچھے نہ لو۔ اللہ کی مرضی کے سارے کام کرو، تم بھی اللہ والے بن جاؤ۔"

یہ سن کر میرا جی چاہا کہ میں بھی اللہ کی مرضی کے کام کرنے لگوں۔ اچھے، برے کام سبھی جانتے ہیں۔ لیکن میں نے کہا۔ "مولوی صاحب! میں نہ پڑھا نہ لکھا۔ الف کے نام لٹھ بھی نہیں جانتا، میں کیا جانوں اللہ کی مرضی کیا ہے؟"

میری اس بات کا جواب مولوی صاحب نے یہ دیا کہ اچھا آؤ ساتھ کھانا کھا لو۔ اب میں تم کو پڑھانا شروع کردوں گا۔ اور ہر روز اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی باتیں بتایا کروں گا۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب نے ہاتھ پکڑ کر بیٹھا لیا۔ مجھے دل ہی میں بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن میں مولوی صاحب کے لحاظ کے مارے اچھی طرح کھا نہیں رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دنیا میں ایسے بھی بھلے لوگ ہیں جو بُرے لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بُرے لوگ اچھے بن جائیں۔ مولوی صاحب کے ساتھ کھانا تو میں نے

یوں ہی کچھ کھایا لیکن میں باغ باغ ہو گیا۔ میرے دل نے مجھ سے کہا۔ ''ایسے بزرگ کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ تو اب چاہئے کہ انھی جیسا بن جا اور توبہ کر لے برے کاموں سے۔'' اور بھئی! سچ پوچھو تو میں نے دل ہی دل میں توبہ بھی کر لی لیکن مولوی صاحب سے ابھی کچھ نہ کہا۔

دوسرے دن جب چائے بنا کر پیش کی۔ تو چائے بھی ساتھ پلوائی۔ اس کے بعد مولوی صاحب کے گھر سے کوئی چیز آتی تو مولوی صاحب مجھے زیادہ کھلاتے پلاتے۔ اپنے آپ تھوڑی ہی کھاتے۔ انھیں کھانے پینے کا زیادہ لالچ نہ تھا۔ وہ تو بس زیادہ تر لکھتے پڑھتے رہتے۔ یا پھر جو محنت کرتے وہ یہ تھی کہ مجھے پڑھاتے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ ''میں اب اس عمر کا ہو گیا ہوں کیا پڑھ سکوں گا۔''

''کیا عمر تھی اس وقت آپ کی بابا؟'' ہم کئی لڑکوں نے ایک ساتھ سوال کیا۔

''ہوگی کوئی پینتیس سال کی۔'' اور پھر کہنے لگے۔ ''مگر بھائی! مولوی صاحب کے پڑھانے کا طریقہ ایسا تھا کہ میں کیا بتاؤں۔ باتوں باتوں میں پڑھا دیتے اور لکھنا سکھا دیتے۔ کہتے۔ ''ارے کیا تم سیدھی کھڑی لکیر نہیں بنا سکتے۔'' میں جواب دیتا۔ ''کیوں نہیں بنا سکتا۔'' فرماتے۔ ''اچھا تو بناؤ۔'' میں یوں ''ا'' (میں نے زمین پر بنا کر دکھایا) تو مولوی صاحب بتاتے۔ ''یہی تو الف ہے۔'' اس کے بعد کہتے ہیں۔ ''اچھا پڑی لکیر بناؤ۔'' میں یوں بناتا۔ ''ــ'' مولوی صاحب کہتے اچھا اس کے نیچے ایک نقطہ لگاؤ ''ـِـ'' پھر بتاتے ایسی پڑی لکیر کے نیچے ایک نقطہ لگاؤ تو ''ب'' تین نقطے بناؤ تو

’’پ‘‘ اور دو نقطے اوپر ہوں تو ’’ت‘‘ بس اسی طرح ایک ہفتے میں سارے حروف پہچنوا دیئے اور مجھ سے کہہ دیا کہ زمین پر بنا بنا کر خوب مشق کر ڈالو۔‘‘

میرا دل بھی لگ گیا۔ میں خوب مشق کرتا۔ اب جو میرا شوق بڑھا اور میں نے پڑھنے میں دل لگانا شروع کیا تو روز ایسا ہوتا کہ مجھ سے کہتے۔ اچھا تم سبق یاد کرو۔ چائے میں اپنے آپ بنائے لیتا ہوں۔ یا پھر کھانا پکانے میں مدد کرتے اور وہی کھانا جو میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں پکاتا، اب آدھے پونے گھنٹے میں پک جاتا۔ اس کے بعد وہی لکھائی پڑھائی شروع ہو جاتی۔

میرے لئے کتاب تو تھی نہیں۔ بس زبانی ہی مولوی صاحب الف زبر، زیر، پیش اور دل، دم، آدم، اب، رب، رٹ وغیرہ پڑھایا کرتے اور میں زمین کو تختی سمجھ کر اس پر انگلی سے لکھنے کی مشق کرتا۔‘‘

مہینے بھر کے اندر مولوی صاحب کے گھر سے دو کاپیاں آ گئیں۔ ان میں سے ایک مجھے دی اور اپنا قلم دیا اور کہا۔ اب اس پر لکھا کرو تو اس اس طرح انھوں نے مجھے پڑھایا لکھایا۔ لیکن جتنا پڑھایا لکھایا۔ اس سے زیادہ زبانی بتایا۔ زبانی تو انھوں نے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ دوسرا مولوی صاحب کیا بتا سکتا۔ مولوی صاحب مجھے زبانی جو کچھ بتاتے تھے وہ اسلامی عقیدے کی باتیں تھیں۔‘‘ یہ کہتے بابا نے کوکو سے پوچھا۔

’’اچھا میاں! ذرا کلمہ تو سناؤ۔‘‘ کوکو نے سنا دیا۔ ’’لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ‘‘ ہاں شاباش! مولوی صاحب نے مجھ سے صاف کلمہ سنانے کو کہا تو میں ہکّا بکّا ہو

کر مولوی صاحب کا منہ تکنے لگا۔

''جیسے اس دن شوکت میاں سے ماسٹر صاحب نے پوچھا۔ ''ننھا! رسولؐ کے معنیٰ؟'' اور شوکت میاں ہکّا بکّا رہ گئے تھے۔ یہ بات صفو نے مسکرا کر کہی، اور شوکت میاں جھینپ گئے اور پھر شوکت میاں نے وہی مثل کہی کہ ''کھسیانی بلّی کھمبا نوچے۔'' صفو کا پلو پکڑ کر زور سے کھینچ لیا اور کھینچے چلے گئے۔

بابا نے منع کیا ارے بھئی یہ کیا شروع کر دیا۔ سنو تو میں کیا کہتا ہوں۔ اچھا تو میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ جب کسی نے بتایا نہیں تو میں کیا سناتا، ساری عمر چوری اور ڈکیتی میں گذری تھی اسی لئے تو میں کلمہ سنا نہ سکا تو مولوی صاحب نے بار بار کہہ کر اور مجھ سے کہلا کر یاد کرایا اور پھر میں دن بھر کلمہ رٹتا رہا۔

دوسرے دن جب میں نے سنا دیا تو مولوی صاحب نے اس کے معنیٰ بتائے کہ ''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں۔''

پھر عبادت کے معنیٰ یہ بتائے کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ اور وہ ہمارا مالک اور مولا ہے۔ ہمیں اس کے حکموں کو ماننا چاہئے اور اسی کے حکموں کے مطابق سارے کام کرنا چاہئے۔ رسول کے معنیٰ یہ بتائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکموں کے بارے میں جس طرح کرنے کو بتایا ہے اور کر کے سکھایا اور دکھایا، اسی طرح سب کام کرنا چاہئے۔

یہ باتیں میرے دل میں اتر گئیں اور میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ ''اب میں بھی سب کام اسی طرح کروں گا۔ جس طرح پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے

ہیں اوراب میں توبہ کرتا ہوں کہ ''نہ چوری کروں گا، نہ ڈاکہ ڈالوں گا، نہ بغیر پوچھے کسی کی چیز لوں گا۔ نہ لڑائی دنگا کروں گا۔''

مولوی صاحب میری اس توبہ سے بہت خوش ہوئے اور پھر روز دین کی باتیں بتانے لگے۔ قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے لگے۔ پھر نماز سکھا دی۔ پھر اپنے ساتھ نماز پڑھوانے لگے۔ جس طرح مولوی صاحب بتاتے، اسی طرح میں سب کام کرنے لگا۔

ایک دن میں کھانا پکا رہا تھا۔ نمک نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بوری نمک کی ایک طرف رکھی تھی۔ میں اس میں سے مٹھی بھر کے نمک لے آیا۔ اسی وقت مولوی صاحب نے ٹوکا۔ ''یہ نمک کیوں لائے، کس سے پوچھا، بُری بات ہے۔'' اور پھر نمک وہیں رکھوا دیا۔ اور اس دن بے نمک ہی کھانا کھایا۔ میں دنگ رہ گیا۔

تیسرے پہر جیلر صاحب آئے تو میں نے سارا قصہ کہا۔ جیلر صاحب نے مولوی صاحب کو ایک نظر دیکھا۔ اور چلے گئے۔ اور پھر بہت سا نمک بھجوا دیا۔

مولوی صاحب کے پاس رہتے رہتے میری بُری باتیں چھوٹ گئیں اور میں نے اچھی باتیں سیکھ لیں۔ اب جیلر مجھ سے بڑا خوش رہنے لگا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے میرے لئے سرکار کو بڑی اچھی رپورٹ بھیجی۔ اس رپورٹ کا اثر یہ ہوا کہ میری سزا میں کمی ہو گئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد میں جیل سے باہر کر دیا گیا۔

پھر چوری

جیل سے چھوٹ کر میں باہر آیا تو سوچنے لگا۔ کہاں جاؤں؟ میں نے سوچا: محنت

مزدوری کر کے پیٹ پالوں گا اب برے کام نہ کروں گا۔ لیکن ''بد اچھا بدنام بُرا'' والی مثل تم نے سنی ہوگی۔ میں نہ جانے کہاں کہاں محنت مزدوری اور نوکری کے لئے گیا۔ لیکن کسی نے مجھے کام پر نہ لگایا۔ سب کو یہ کھٹکا تھا کہ یہ چور اُچکّا اور ڈاکو آدمی نہ جانے کیا لے کر چل دے۔

کچھ رقم مولوی صاحب نے مجھے دے دی تھی۔ وہ میرے پاس سے ختم ہوگئی۔ اب بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی۔ اچانک ایک دن بھوپت ڈاکو سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''ارے یار! آؤ، آج بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے۔ بیگم صاحبہ آج محل میں اکیلی ہیں۔ چلو ان کے محل میں چوری کریں۔ بڑا مال ہاتھ آئے گا۔''

بھوپت سے یہ جو سنا تو کچھ کچھ میرا بھی جی چاہنے لگا۔ پھر میں بھوکا بھی تھا۔ بولا تو کچھ بھی نہیں مگر رات کو جب بلانے آیا تو میں اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں میرا دل مجھ کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ مولوی صاحب سے کیا کہہ کر آیا ہے۔ تیری توبہ کیا ہوئی؟'' مگر میں پھر بھی بھوپت کے ساتھ چلا ہی جا رہا تھا۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ نیک بنے رہنے کے لئے نیک لوگوں کے ساتھ رہنا بڑی نعمت ہے۔ پھر میرا ساتھ تھوڑے ہی دنوں مولوی صاحب سے رہا تھا۔ میں نیکیوں پر جمنے کے لئے پکا نہ ہوا تھا۔ تو بھائی! کیا بتاؤں پھر شیطان کے پھندے میں آگیا اور رات کو بیگم صاحبہ کے محل میں جا گھسا۔

محل سچ مچ خالی تھا۔ چاروں طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ بھوپت کے ساتھ میں بیگم

صاحبہ کے کمرے کی طرف چلا۔ کواڑ کھلے تھے۔ بلب کی روشنی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن وہاں میں نے جو کچھ دیکھا، اس سے مجھے مولوی صاحب یاد آ گئے اور میرا ایمان تازہ ہو گیا۔

کمرے میں بیگم صاحبہ تہجد کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ بھوپت نے ڈنڈا تانا کہ بیگم صاحبہ کے مارے لیکن میں نے اس کا ڈنڈا پکڑ لیا اور کہا کہ ایسی اللہ والی عورت پر ہاتھ اٹھانا نامردی ہے۔

اب بھوپت مجھ سے لڑنے لگا۔ اس نے زور سے ڈنڈا میرے سر میں مارا۔ میں نے جی کڑا کر کے اس کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ اب وہ مجھ سے لپٹ پڑا اور اب ہم دونوں میں دھینگا مشتی ہونے لگی۔"

بیگم صاحبہ نے جلدی جلدی سلام پھیرا۔ مڑ کر دیکھا تو ہم دونوں کشتم کشتی کر رہے تھے۔ میں کہہ رہا تھا کہ اس گھر میں تم ڈاکہ نہیں ڈال سکتے۔ "ایسی اللہ والی بوڑھی عورت کو مار نہیں سکتے۔" بھوپت مجھے گالیاں دے رہا تھا۔

اتنے میں بیگم صاحبہ پکاریں:

"کون ہو تم دونوں؟"

نہ جانے بیگم صاحبہ کی آواز میں کیا رعب تھا کہ میں بھوپت کو چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا اور بھوپت یہ جا وہ جا۔ دیوار پھاند کر نکل گیا۔

بیگم صاحبہ نے دیکھا کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "بیٹھ

جاؤ۔'' میں بیٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ ایک شیشی لے آئیں۔ انھوں نے ایک کپڑے سے میرا خون صاف کیا اور شیشی کی دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ خون بہنا بند ہو گیا۔ اس کے بعد میرا حال پوچھا۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری رام کہانی سنائی۔ جیل میں مولوی صاحب کے ساتھ کا بھی ذکر کر دیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے مجھے آدھی رات کے وقت ہی کھانا کھلایا اور ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''وہاں جا کر سو رہو۔ سویرے تمہارے لئے کوئی کام سوچ لیا جائے گا۔'' میں جا کر سو رہا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ میں کئی مہینے تک بیگم صاحبہ کے یہاں رہا۔ بیگم صاحبہ بھی بڑی دیندار عورت تھیں۔ میں نے ان سے بھی بہت سی دین کی باتیں سیکھیں۔ وہ بیگم صاحبہ مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا کرتی تھیں کہ مولوی صاحب بیمار تو نہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کو کھانا پانی وقت سے ملتا تھا؟ مولوی صاحب کو زمین پر سونے سے تکلیف تو نہ ہوتی تھی؟ اسی طرح اور بہت سی باتیں پوچھا کرتی تھیں۔

''بابا ذرا ٹھہریئے تو۔'' شوکت میاں نے بابا سے پوچھا۔

''یہ تو بتایئے وہ بیگم صاحبہ مولوی صاحب کو بار بار کیوں پوچھا کرتی تھیں؟''

شوکت سے یہ سوال سنا تو بابا مسکرائے۔ بولے ارے بھئی! میں نے بھی بیگم صاحبہ سے یہی سوال کیا تھا۔ تو وہ مسکرائیں تھیں۔ لیکن بتایا نہیں۔ جواب دیا کہ کچھ دنوں کے بعد آپ سے آپ معلوم ہو جائے گا۔ بیگم صاحبہ کے یہ کہنے سے میں چپ ہو گیا۔

''تو پھر کیا معلوم ہوا؟'' اب میں نے بابا سے پوچھا۔ بابا مسکرائے اور بولے۔

''بھئی! اس کا وہی جواب ہے، جو بیگم صاحبہ نے مجھے دیا کہ ابھی آپ سے آپ معلوم ہو جائے گا۔ ذرا سنتے جاؤ میری آپ بیتی۔'' اور بابا اسی کے ساتھ ہمارے کچھ کہے بغیر آپ بیتی کہنے لگے۔

''اچھا تو میں بیگم صاحبہ کے گھر کئی مہینے رہا۔ ایک دن ڈاکیہ تار لایا۔ بیگم صاحبہ نے تار پڑھا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ مجھ کو آواز دی اور کہا کہ جلدی چلنے کا سامان کرو۔ میں نے پوچھا۔ ''بیگم صاحبہ کہاں؟'' بولیں۔ ''میرے میکے۔'' اس کے بعد وہ اٹھیں اور جھٹ جھٹ سامان مجھے دینے اور بتانے لگیں۔ انھوں نے جلدی میں بہت تھوڑا سا سامان لیا۔ انھیں میکے پہنچنے کی بڑی جلدی تھی۔ میں نے اس جلدی کا سبب پوچھا تو پھر مسکرائیں اور بولیں وہیں چل کر معلوم ہو جائے گا۔ اس جواب پر میں بہت جھنجھلایا۔ میرے جھنجھلانے پر بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں، پھر بتایا۔

ارے بھئی! تمہارے مولوی صاحب جیل سے چھوٹ کر گھر آ گئے۔''

''ایں گھر آ گئے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔'' میری زبان سے نکلا اور اب سوچنے لگا کہ یہ بیگم صاحبہ یا تو مولوی صاحب کی بہن ہیں یا کوئی اور قریبی رشتہ دار۔''

اچھا اب سنئے۔ میں بیگم صاحبہ کے ساتھ ان کے میکے پہنچا۔ گھر جا کر اترا۔ بیگم صاحبہ تو اندر چلی گئیں۔ میں ایک کمرے کی طرف چلا۔ کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور بیچ میں مولوی صاحب بیٹھے تھے۔ جیل کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سنا، وہ اس وقت کہہ رہے تھے کہ جیل میں ایک بڑا اچھا آدمی ملا تھا۔ وہ بیچارہ بچپن میں برے

لوگوں کے ساتھ پڑ گیا اور چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے لگا۔ پھر وہ جیل گیا۔ اسی جیل میں، جس میں میں تھا۔

میں نے یہ سنا تو سمجھ گیا کہ مولوی صاحب میرا حال بتا رہے ہیں۔ میں ایک کنارے کونے میں مولوی صاحب سے چھپ کر کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ مولوی صاحب سارا حال کہہ چکے تو کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر کہا۔ ''نہ جانے بے چارہ اب کہاں اور کس حال میں ہو۔''

میں نے سنا تو محبت کے مارے میرے آنسو نکل پڑے۔ اور میں جھٹ مولوی صاحب کے سامنے جا پہنچا۔ اور السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے اچانک مجھے دیکھا تو خوشی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ پھر سارا حال پوچھا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں بیگم صاحبہ کے یہاں تھا تو اور بھی خوش ہوئے۔ اس کے بعد بتایا۔ ''وہ بیگم صاحبہ میری بڑی بہن ہیں۔'' اب تو میں بہت خوش ہوا اور اللہ کی قدرت پر ہکّا بکّا رہ گیا کہ اللہ نے کس طرح جیل سے چھڑا کر اچھی جگہ بھیج دیا۔

مولوی صاحب نے جیل سے چھوٹنے کی بڑی خوشی منائی۔ اس کے بعد پھر جب بیگم صاحبہ گھر جانے لگیں۔ تو مولوی صاحب کو پاس بلایا اور کہا۔ ''لو بھئی! اپنی امانت۔'' مولوی صاحب نے پوچھا۔ ''کیا امانت کیا؟'' تو بیگم صاحبہ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ ہے آپ کی امانت، میں نے اسے خوب اچھی طرح رکھا، اس

سے پوچھ لواور اب میں چلی۔"

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ اپنے گھر چلی گئیں۔ میں مولوی صاحب کے گھر رہنے لگا۔ مولوی صاحب کے تین بیٹے تھے۔ چھوٹے میاں کی عمر اس وقت دس سال کی تھی۔ مجھ سے کہا۔" بھئی! چھوٹے میاں کی دیکھ بھال تمہارے ذمّے ہے۔" بس اس وقت سے میں تھا اور چھوٹے میاں۔ دن رات ان کے ساتھ رہتا۔ چھوٹے میاں اسکول جاتے تو میں ساتھ جاتا۔ وہ کھیلنے جاتے تو میں ساتھ جاتا۔ میں ہر جگہ ان کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔ کسی بُری جگہ بیٹھنے نہ دیتا۔ میں چھوٹے میاں کو ہر طرح کی اچھی اچھی باتیں بتایا کرتا تھا۔ چھوٹے میاں مجھے بابا کہا کرتے تھے۔ میں نے اب دل میں سمجھ لیا کہ یہی میرا گھر ہے۔ چھوٹے میاں لکھ پڑھ کر بڑے نیک بنے۔ انہوں نے اللہ کے بندوں کو دین کی باتیں بتانے میں اپنی زندگی لگا دی۔ چھوٹے میاں کی اس بات سے مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ پھر چھوٹے میاں کی شادی ہوئی۔ شادی کے تین سال بعد مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اب میں گھر میں سب کا بڑا بوڑھا تھا۔ گھر میں میرا حکم چلنے لگا۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے، کیا جوان سب میرا ادب کرتے تھے۔ میری نصیحتیں دھیان سے سنتے، میں بھی بہت خوش تھا۔ اور اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔" بابا نے اپنی رام کہانی ختم کر دی۔

"پِھل پِھل، چھُنئے تو بابا دان......" توتلی پپّو آپ بیتی ختم ہوتے ہی بولی۔" یہ تو بتایئے آپ ہمالے (ہمارے) گل (گھر) کیسے آئے؟"

سچ مچ یہ سوال ہم سب کے دل میں بھی آیا تھا۔ بابا یہ سوال سن کر ہنسے اور بولے۔ ’’ارے بھئی! میں تمہارے ہی گھر تو رہا ہمیشہ۔‘‘ ایں! تو مولوی صاحب ہمارے دادا تھے۔‘‘ ہم سب نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ بابا بولے۔ ’’ہاں بھئی! اللہ تعالیٰ تم سب کو مولوی صاحب جیسا نیک بنائے۔‘‘ ہم سب بابا کی آپ بیتی سن کر بہت خوش ہوئے اور اللہ کی اس قدرت پر خوشی کے مارے جھوم گئے کہ وہ کس طرح پتھر سے ہیرا بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے بستروں پر جا سوئے۔‘‘

☆☆☆

اشاعت اوّل 1985

اشاعت نَو **FEB-2014**

قیمت .... Rs. **18/-**

ناشر:- نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی

۲۰۳۵ رقاسم جان اسٹریٹ، بلی ماران، دہلی-۶

فون: **011-65363445,9015603676**